دارالعلوم دیوبند: آغاز وارتقاء کا تحقیقی جائزہ

*ریحانہ قریشی

**مہر محمد سعید اختر

Abstract

The purpose of the paper was to respond criticism of western/ non-Muslim critics and reflect the real picture of Darul Aloom Deoband. Keeping in view the current situations, the system of Darul Aloom Deouband and the other institutions established under its influence can be studied under two aspects. Firstly, this system was the nursery for mujahidins and secondly, it was the training center for terrorists. Moreover the Ulema, educated from here, were considered so extremist/fanatic that they were unable to compete with the modern challenges of the world. The paper objectively helps in understanding the establishment of Darul Aloom Deouband which had specific background, objectives, syllabus, teaching methodology and system of examination. It has been observed that it had no political motives and produced good Ulema, muftis, journalists, doctors, authors and preachers. Furthermore, the degree holders of Darul Aloom Deouband served the public religious needs from its inception till today.

Keywords: Darul Aloom Deoband, Teaching Methodology, Donation, Objectives

تاریخی پس منظر:

انگریزی تسلط نے برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ نا صرف ان کی معاشرت ومعیشت کو تہ وبالا کیا بلکہ اِن کا تعلیمی نظام بھی تلپٹ کر دیا(1)۔ جو متبادل نظام انگریزوں نے نافذ کیا، مسلمان اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ خود انگریز ماہرین نے مسلمانوں کو ان کے اس رویے میں حق بجانب قرار دیا۔ حکومت ہند کے سیکرٹری امور داخلہ مسٹر بیلی اعتراف کرتے ہیں: اس میں قطعاً کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے احتراز کرتے ہیں جو اگر چہ فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر اُن کے ملّی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ درحقیقت اس سے اُن کے ضروری سے ضروری تقاضے بھی پُورے نہیں ہوتے یہ طرزِ تعلیم لازماً اُن کے مفاد کے

*ڈیپارٹمنٹ آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینٹیز، ایگری کلچر یونیورسٹی، فیصل آباد

**ادارہ تعلیم وتحقیق، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

خلاف اوراُن کی مِلّی روایات کے منافی ہے۔(2)

مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔انہوں نے تھانہ بھون اور شاملی کے علاقوں میں جنگ آزادی میں بھرپور شرکت کی تھی(3)۔دراصل علماء نے انگریزی تسلط کا خطرہ بہت جلد بھانپ لیا تھا۔چنانچہ 1803ء میں جب انگریزوں نے ملک کے اکثر حصوں پر قبضہ کرلیا تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے برصغیر کو دارالحرب قرار دیا۔شاہ عبدالعزیز انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کو روکنے کیلئے ابھی ابتدائی مرحلے کی تکمیل ہی کر پائے تھے کہ انتقال ہوگیا۔پھر اس تحریک آزادی کو سیّد احمد شہید اور شاہ اسماعیل نے آگے بڑھایا اور آزادی وطن کیلئے خاندان ولی اللہ کے یہ چشم و چراغ 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے۔(4)

سیاست کے میدان میں شکست کے بعد مسلمان اہل فکر نے تعلیم کے میدان میں دفاعی جدوجہد شروع کی۔دارالعلوم دیوبند اس جدوجہد کی پہلی کوشش تھی۔لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی (5)۔یہ آواز ایک فاتح اور برسر اقتدار قوم کی تھی۔اس نے اس آواز کی حقیقت جتانے کیلئے تعلیم کو ہی ذریعہ بنایا تھا۔جو ایک انقلاب آفرین اور کامیاب حربہ تھا۔یہ خطرناک انقلاب دیکھ کر مولانا نانوتوی نے دارالعلوم قائم کیا اور نعرہ لگایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور دل و دماغ سے مسلمان ہوں۔جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات پیدا ہوں اور دین و سیاست کے اعتبار سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو۔(6)

دارالعلوم دیوبند کے محرکین اساسی طور سے تحریک مجاہدین کے وہ سپاہی تھے جنہوں نے بالاکوٹ میں ہزیمت کے بعد 1857ء کے موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے شاملی کے محاذ پر فرنگی کافروں کے خلاف جہاد کیا۔اگرچہ اس وقت انگریزوں کے خلاف محاذ آراء لشکر کا مرکزِ اطاعت بہادر شاہ ظفر تھے لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کی جماعت کو یقین تھا کہ مغل شہنشاہ میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا۔چنانچہ انہوں نے اپنا نظم و نسق بالکل الگ رکھا جس کے تحت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی امام یعنی بیعت جہاد کے مرکز قرار پائے۔حافظ محمد ضامن کو علمدار لشکر مقرر کیا گیا،مولانا رشید احمد گنگوہی کو خطابت کے ذریعے مجاہدین میں جوش و استقلال پیدا کرنے کی خدمت سپرد ہوئی

اورمولانا نانوتوی امیرلشکر قرار پائے۔(7)

مولانا محمود مدرسہ دیو بند کا تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کیلئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیو بند تشریف لائے۔اپنے سامنے ایک شاگرد کو(کہ اُن کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخر کار شیخ الہند مولانا محمود حسن کے لقب سے مشہور ہوئے)بٹھا کر کسی عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہورِ عالم درسگاہ دارالعلوم دیو بند کا افتتاح کر دیا۔نہ کوئی مظاہرہ تھا نہ شہرت پسندی کا جذبہ۔نہ نام ونمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹر واشتہارات کی بھرمار۔بس ایک شاگرد اور ایک استاد۔شاگرد بھی محمود اور استاد بھی محمود، دونفر سے یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آ گئی۔یوں جامعیت واعتدال اور دین ودانش کے ملے جُلے اندازوں کے ساتھ اس درسگاہ میں تعلیم وتربیت کا خط مستقیم کھینچا گیا۔(8)

مقاصد:

دارالعلوم کا مقصد واضح طور پر یہ تھا کہ مسلمانوں میں علوم اسلامی کی اشاعت کی جائے اور یہ کام ہر زمانہ میں اہم رہا ہے لیکن اس وقت اس کی اہمیت کئی وجوہ سے بڑھ گئی تھی۔اوّل یہ کہ انگریزوں نے مسلمانوں کا سابقہ نظام تعلیم درہم برہم کر دیا تھا اور مالی وسائل برباد ہو جانے کی وجہ سے دوچار کے علاوہ تمام مدرسے بند ہو گئے تھے جن میں دینی تعلیم ہوتی تھی۔دوم یہ کہ حکومت کی اعانت سے ملک میں مسیحیت کی تبلیغ ہو رہی تھی اس کا انسداد ضروری تھا۔ تیسرے حکومت کا جاری کردہ نظام تعلیم جس کا مقصد ہندوستان میں ایک ایسی جماعت پیدا کرنا تھا جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی مگر خیالات، تصورات اور طرز فکر کے اعتبار سے انگریز ہو اور ہندوستانیوں میں حکومت کی ترجمانی کرے، کا موثر بندوبست کرنا تھا۔چوتھے یہ کہ اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد ملک میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور فکری تنظیم کا کوئی مرکز باقی نہیں رہا تھا۔لہٰذا ایسے مراکز کا احیاء بھی دارالعلوم کے مقاصد میں تھا۔(9)
دارالعلوم دیو بند کے قیام کی غرض وغایت یہ تھیں کہ:

- مسلمانوں میں ایمان اور توکل پیدا ہو جائے۔بدعات اور مکروہات سے محفوظ ہو کر دین کے صحیح فہم کی دولت بے کراں سے مالا مال ہو کر انگریزی اقتدار اور انگریزی تہذیب وتمدن سے مکمل نجات حاصل کر سکیں۔(10)
- مسلمانوں کو کفر کی یلغار سے محفوظ کیا جائے۔اس کی عملی صورت یہ محسوس کی گئی کہ ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے جس میں علوم دینیہ کی تعلیم دے کر مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھالی جائے۔(11)
- علوم اسلامیہ کے لئے ایسے ماہرین تیار کئے جائیں جو اپنے اخلاق وکردار، بے نفسی، للّٰہیت اور ایثار کا نمونہ بن

کر اُمّت کے سامنے آئیں یعنی دینی علوم کی تحصیل کا مقصد رضائے الٰہی ،تفقہ فی الدین، دعوت وتبلیغ اور نیابتِ انبیاء کے فرائض انجام دینا تھا۔ پیش نظر یہ تھا کہ اس وقت جبکہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام تباہ و برباد کیا جارہا ہے۔قدیم بنیادوں پر ایک متبادل نظام قائم کر دیا جائے۔(12)

- غرض دارالعلوم دیوبند برصغیر کی معاصرانہ صورت حال کا ایک منطقی ردعمل تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اہل ہند کو شکست دے کر سیاسی غلبہ حاصل کرنے سے بہت قبل تعلیم کے میدان میں انگریزوں نے اپنی استعماریت کا آغاز کر دیا تھا۔ میکالے کا اعلان (1835ء) صریح تھا کہ انگریزی نظام تعلیم کے ذریعے ہندوستانیوں میں ایسے لوگ پیدا کیے جائیں جو ذہنی اعتبار سے انگریزوں کے غلام ہوں۔ دارالعلوم دیوبند نے اس استعماری تعلیمی نظام کے سامنے بند باندھنے کو اپنا مطمح نظر بنایا تا کہ مسلمانوں کی جہالت کو دور کیا جائے۔ان کے عقائد، رسم ورواج اور رہن سہن کی اصلاح کی جائے (13)۔ مدرسے کے مقاصد کا درج ذیل نکات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو دارالعلوم دیوبند میں رہنما اصولوں کی حیثیت رکھتے تھے:

- ادارے کو پبلک چندوں سے چلایا جائے گا۔
- طلبہ کیلئے اقامت کا انتظام ہوگا تا کہ انہیں تعلیم کے ساتھ ساتھ جہاد کی تربیت بھی دی جاسکے۔
- جمہوری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مہتمم مشوروں سے کام لے گا۔
- اساتذہ کی عزت برقرار رکھی جائے گی۔
- خدا پر مکمل بھروسہ کیا جائے گا اور اسی کی تعلیم دی جائے گی۔
- گورنمنٹ سے کوئی امداد نہیں لی جائے گی تا کہ اس کا اثر مدرسہ پر نہ پڑ سکے۔(14)

گویا دارالعلوم کا اساسی کام تعلیم کتاب اللہ، تدریس سنت حدیث رسول ﷺ اور تفقہ فی الدین کی روشنی میں ایسے علماء، مجاہدین، محدثین، فقہاء اور رجال کار پیدا کرنا تھا جو دل و دماغ کے اعتبار سے صحیح مسلمان اور قلب وفکر کی گہرائیوں سے نمونے کے مسلمان ہوں۔(15)

نصابِ تعلیم:

دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں برصغیر کے اس دور کے مسلم تعلیمی مراکز کے اثرات اور وقت کے ساتھ ساتھ حرفتی تعلیم کی طرف رجحان نظر آتا ہے۔اس دور میں اسلامی تہذیب کے دو خاص مرکز فرنگی محل لکھنؤ اور دہلی

تھے۔نصاب تعلیم دونوں مقامات کا درس نظامی تھا مگر اس میں اپنے مذاق کے مطابق بعض چیزیں کم وبیش تھیں۔فرنگی محل میں فقہ اور اصولِ فقہ کے علاوہ علوم معقول پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔دہلی میں حدیث وتفسیر کو سب علوم پر فوقیت تھی اور کتاب وسنت کی تفہیم اور تعلیم کو حاصل تعلیم سمجھا جاتا تھا۔علمائے دیوبند نے مدرسہ ولی اللہ (دہلی) کی پیروی کی اور قدرے تاخیر سے لکھنؤ اور خیرآباد کی خصوصیات کو بھی دیوبند کے نصاب میں اپنایا گیا۔جس سے معقول اور منقول میں توازن پیدا ہوگیا۔(16)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کو وقت کے تقاضوں اور ملک کے حالات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ دارالعلوم دیوبند میں انگریزی، سائنس اور دوسرے ان ضروری علوم کی بھی تعلیم دی جائے جو سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں پڑھائے جارہے تھے مگر افسوس کہ مولانا کی اس خواہش کی تکمیل نہ ہوسکی (17)۔پورا نصاب تعلیم جس میں فارسی کی کلاسیں بھی شامل تھیں 9 سال پر تقسیم کیا گیا تھا۔گویا طالب علم کی عمر کے نو سال اس پر خرچ ہوتے۔اس معمولی نصاب تعلیم کے علاوہ معاشی مقاصد کے لئے طلبہ کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا اور خطاطی، جلدسازی، گھڑی سازی، پارچہ بافی، ہوزری، جفت سازی کے کام بھی شروع کئے گئے۔(18)

اگرچہ انہیں معاشی خود کفالت فراہم کرنے کیلئے نصاب میں طب، خطاطی، جلدسازی اور کپڑا بننے جیسی دستکاریاں شامل کی گئیں مگر ان پیشہ وارانہ مضامین کی تعلیم کا بندوبست نہ کیا جاسکا اور نصاب صرف درس تک محدود رہا(19)۔البتہ ایک مستقل شعبہ دارالصنائع کے نام سے کھولا گیا جس میں مختلف صنعتیں طلبہ کو سکھائی جاتی تھیں۔ دارالعلوم کا نصاب کبھی منجمد نہیں رہا بلکہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد نظر ثانی ہوتی رہی۔نصاب میں قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر تو شامل تھے لیکن ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ جس طرح حدیث کی تعلیم کا اختتام دورہ حدیث پر ہوتا رہا ایسے ہی تفسیر قرآن کا دورہ بھی نصاب میں شامل کیا جائے اور اسے دورۂ حدیث کے بعد رکھا جائے چنانچہ دورۂ تفسیر کا اجراء عمل میں آیا(20)۔اس کے ساتھ ہی تکمیل کے بھی کئی درجات کردیئے گئے جیسے: تکمیل ادب، تکمیل دینیات ،تکمیل معقولات وغیرہ۔مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو جن فنون سے بھی مناسبت ہو اسی درجہ میں داخل ہوکر منتخب فن میں مہارت اور رسوخ حاصل کرلیں بعد میں صنفِ عربی کا درجہ بھی کھولا گیا تاکہ موجودہ جدید عربی بھی طلبہ پڑھ سکیں اور اس زمانہ میں عرب ممالک میں جاکر دین کی بآسانی خدمت کرسکیں۔(21)

دارالعلوم میں ابتداء سے ہی سارے فنون پڑھائے جاتے رہے لیکن علم حدیث میں اس درسگاہ کی خاص

شہرت رہی کیونکہ یہاں کا دورۂ حدیث محققانہ اور مجتہدانہ انداز کا ہوتا اور اساتذہ بڑی تیاری اور محنت سے درس دیتے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد غیر ممالک سے یہاں طلبہ آنے لگے۔وہ طلبہ جو دوسرے مدارس میں حدیث پڑھ چکے تھے بلکہ کئی سال درس بھی دے چکے تھے،اس کی شہرت سُن کر وہ بھی یہاں آ کر درس حدیث میں شریک ہوئے، پورا سال طالب علم کی حیثیت سے یہاں گزارا اور سند حدیث لیکر واپس ہوئے۔ان علماء میں مولانا عبداللہ، مولانا سلامت اللہ، مولانا معشوق علی، مولانا برکت اللہ دہلوی اور مولانا عبدالرحیم علی گنج بہار شامل تھے جنہوں نے یہاں آ کر دورۂ حدیث پڑھا اور یہاں کے درس و فیوض و برکات سے فیض یاب ہوئے۔(22)

گویا تمام اسلامی دنیا سے طلبہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے یہاں آتے۔یہ اسلامی دنیا کی چوتھی یونیورسٹی شمار کی جاتی تھی۔پہلی جامعہ اظہر، دوسری جامعہ زیتون، تیسری جامعہ تیونس اور یہ رہائشی یونیورسٹی تھی جہاں عربی، فارسی، قرآن، طب یونانی اور تبلیغ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ڈرل اور جسمانی تربیت کا بھی انتظام تھا۔جو طلبہ یہاں سے تعلیم حاصل کر کے نکلتے وہ اپنے نام کے آگے دیوبندی لگاتے۔انہیں فاضل کی سند ملتی تھی۔(23)

اس وقت برصغیر میں خوش نویسی کی کمی محسوس کی گئی۔لہٰذا دارالعلوم میں اس طرف خصوصی وضروری توجہ دی گئی اور شعبۂ خوش خطی جاری کیا گیا تاکہ اس فن کے خواہشمند طلبہ فراغت کے بعد خط نسخ اور خط نستعلیق کی مشق کر کے عمدہ کاتب بن سکیں اور بوقت ضرورت اس فن کو ذریعہ معاش بھی بنا سکیں۔اس شعبہ سے بہت سے علماء نے حسن تحریر کی دولت حاصل کی اور انہی کی وجہ سے خط نسخ و نستعلیق میں کتابوں کی اشاعت جاری رہی جو ٹائپ سے بہت ارزاں ہوتی تھی (24)۔دارالعلوم کا قیام اگرچہ اسلامی علوم وفنون کے تحفّظ اور بقا کیلئے عمل میں آیا تھا مگر چونکہ اس وقت تک قدیم روایتی اور تہذیبی قدریں باقی تھیں اس لئے دارالعلوم کے ابتدائی دور میں اس کے فارسی وریاضی کے درجات میں مسلمان بچوں کے ساتھ ہندو بچے بھی پڑھتے تھے۔(25)

المختصر مدرسہ دیوبند اصل میں مدرسہ رحیمیہ کا ہی پیروکار تھا اور اسکی بنیاد علم حدیث پر تھی۔مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں طلبہ کی باقاعدہ جماعت بندی، حاضری رجسٹر پر ان کا اندراج اور تحریری امتحان جیسی جدید مدرسوں کی خصوصیات بھی شامل تھیں۔(26) دینی مدارس کا نصابِ تعلیم اجتماعی ارتقاء کے نتیجہ میں تشکیل پذیر ہوا۔مُلّا نظام الدین سہالوی بانی درس نظامی نے ایک خاص انداز سے نصاب مرتب کیا تھا۔اجتماعی ارتقاء کا عمل اس کے بعد بھی جاری رہا بعض مضامین کو قبولیتِ عامہ حاصل ہوگئی۔یہ علم حدیث، علم ادب اور علم تاریخ ہیں۔یہ اضافہ شدہ نصاب دیوبند کے مدرسے کا نظام تعلیم تھا۔(27)

حکمتِ تدریس:

دیوبند کے نظام تعلیم میں اصولی طور پر صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت اور اصلاح باطن کا بھی انتظام پیش نظر تھا۔ یہاں کا نظام علم اور تقویٰ کے امتزاج کی یہ روایت زندہ رکھنا چاہتا تھا جو مسلمانوں نے اپنی تیرہ سو (1300) سالہ تاریخ میں قائم کی۔ استاد اور شاگرد کا گہرا باہمی ربط بھی اسکی بنیادی خصوصیات میں سے ایک رہا۔ دیوبند کے نظام تعلیم میں طلبہ کے تقریری اور تحریری مقابلے، امتیازی کارناموں پر انعامات اور طلبہ کی علیحدہ تنظیم بھی شامل تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کی تربیت اور اجتماعی زندگی کیلئے تیاری ملحوظ تھی۔(28)

چونکہ بانیانِ دارالعلوم اس پہلو سے سوچتے تھے کہ علوم کی تعلیم کے لئے ملک میں بے شمار سرکاری مدارس ہیں البتہ علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اور یہ علوم ہندوستان میں کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ اسلئے انہوں نے ایسا نصاب تیار کیا جو معقولات ومنقولات اور بعض علوم پر مشتمل تھا۔ یہ نصاب بہت حد تک درس نظامی سے ملتا جلتا تھا بلکہ دارالعلوم کے نصاب کو درس نظامی ہی کہا جاتا تھا۔ دارالعلوم کے طریق درس کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا۔(1) ابتدائی (2) متوسط (3) اعلیٰ (4) تکمیل تفسیر، دینیات، ادب۔(29)

ابتدائی درجات میں اساتذہ کے پیش نظر یہ بات رہتی کہ طلبہ میں کتاب کے مضامین سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے، اسلئے کتاب فہمی پر زیادہ زور دیا جاتا۔ متوسط درجات میں کتاب فہمی کے ساتھ زیر درس کتاب کے علاوہ اس فن کے ایسے مباحث بھی زیر بحث لائے جاتے جو طلبہ کے ذہن میں وسعت پیدا کرنے اور اُن کا ذہنی معیار بلند کرنے کیلئے ضروری ہوتے۔ اعلیٰ درجات میں زیر درس فن کی تعلیم وتفہیم پر مکمل زور دیا جاتا۔ مگر اسی کے ساتھ کتاب فہمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ دارالعلوم کا طریق تعلیم یہ تھا کہ پہلے طالب علم کتاب کی عبارت پڑھتا۔ اُستاد کا فرض تھا کہ پڑھی ہوئی عبارت پر فنی حیثیت سے اس جامعیت کے ساتھ تقریر کرے جس میں متعلقہ عبارت کے ہر پہلو اور مسئلہ پر روشنی پڑ جائے۔(30)

اُستاد کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کی بحث میں موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آجائیں اور وہ اپنی تقریر عبارت پر منطبق کرکے طالب علم کو مطمئن کردے، طلبہ درس میں بالکل آزاد ہوتے۔ انہیں اس بات کا مستحق سمجھا جاتا کہ جب تک سبق پوری طرح نہ سمجھ لیں، جتنے اعتراض زیر غور درس کے متعلق اُن کے ذہن میں آئیں اور اُن کا اطمینان بخش جواب اُستاد سے نہ سن لیں اُستاد کو آگے بڑھنے نہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک طرف تو طالب علم پوری محنت کے ساتھ درس میں شریک ہوتا اور دوسری طرف اُستاد بھی پوری محنت اور توجہ کے ساتھ پڑھانے پر

مجبور ہوتا۔عموماً زیر مطالعہ درسی کتب میں اساتذہ کی توجہ اس امر پر مرکوز رہتی کہ طلبہ میں کتاب فہمی کی استعداد پیدا ہوجائے اور اُنہیں مصنّف کا منشاء سمجھنے کا طریقہ معلوم ہوجائے۔(31)

علم الحدیث میں مشکوٰۃ المصابیح کے علاوہ حسب ذیل کتب نصاب میں داخل تھیں۔صحیح بخاری،صحیح مسلم، جامع ترمذی،سنن ابی داؤد،سنن نسائی،سنن ابن ماجہ،موطا امام مالک،موطا امام محمد،شرح معانی الآ ثارطحادی،شمائل ترمذی(32)۔ان کتب میں اوّل الذکر چار کتابوں کو بالاستیعاب ختم کرایا جاتا اوران کے مضامین پر پوری بحثیں ہوتیں۔بقیہ کتابوں کا استیعاب ضروری نہیں تھا۔اساتذہ ان کتابوں کے چند اسباق میں اس قسم کی تقریر کرتے جس سے اس کتاب کا منشاء معلوم ہوجاتا۔اوّل الذکر اور موخر الذکر کتابوں میں چونکہ احادیث کا بیشتر حصّہ مشترک ہوتا اس لئے اُن کے سبق میں ہر ہر حدیث پر جُداگانہ بحث کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔حدیث کے درس میں رُوات حدیث پر جرح وتعدیل سے متعلق بقدرضرورت مختصر بحث ہوتی۔اس کے بجائے فن حدیث پر توجہ زیادہ دی جاتی تاکہ استنباط مسائل اورطریق استخراج کی قوت زیادہ سے زیادہ طلبہ میں پیدا ہوجائے اوروہ ائمہ فقہ کے طریق استنباط پوری طرح سمجھ سکیں۔البتہ اگر کسی سند یا راوی کی نسبت ائمہ مذاہب کوخصوصی توجہ کرنے کی ضرورت پیش آتی تو اسے زیر بحث لایا جاتا جو دوران درس ناگزیر ہوتا تھا۔(33)

مگر ائمہ اربعہ کے دلائل اُن کے اصول استخراج،مسائل اوراحناف کی جانب سے ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات اس سنجیدہ اورعلمی طریق سے طلبہ کے ذہن نشین کرائے جاتے کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی وقعت وعظمت کم نہیں ہونے پاتی بلکہ نہایت وسعت نظر کے ساتھ ائمہ ثلاثہ کے دلائل وبراہین طلبہ کے سامنے پیش کئے جاتے۔چونکہ اکثر کتب حدیث وتفسیر جو دارالعلوم کے نصاب میں شامل تھیں،شوافع اور مالکیہ کی مدون کی ہوئی تھیں اسلئے اُن ائمہ کے دلائل تو لازمی طور پر طلبہ کے سامنے آجاتے۔اس وجہ سے اساتذہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ احناف کے مسلک دلائل وشواہد کی روشنی میں اس طرح رائج قرار دیں کہ ائمہ ثلاثہ کی مجتہدانہ عظمت اپنی جگہ پر برقرار رہےاوراس میں کوئی فرق رونما نہ ہونے پائے۔(34)

بڑی جماعت کے باذوق طلبہ متقدمین کی روش کے مطابق استاد کی تقریر کوقلم بند کرنا ضروری خیال کرتے۔چنانچہ حضرت گنگوہی اورحضرت شیخ الہند کے درس ترمذی کی تقریر،مولانا سیّد محمد انورشاہ کے درس صحیح بخاری کی تقریر العرف الشذی اورفیض الباری جو چار ضخیم جلدوں میں ہے۔اسی ذوق املا کا نتیجہ تھیں۔اسطرح کی املائی تقریروں میں سے یہ چند مثالیں ہیں جوچھپ چکی تھیں۔جو نہ چھپ سکی تھیں اُن کا شمار بھی مشکل ہے۔متاع علمی کے

یہ جواہر ریزے بکثرت فضلائے دارالعلوم کے پاس موجود تھے۔اُستاد کی تقریر اُردو میں ہوتی جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی البتہ جو طلبہ اُردو نہیں سمجھتے انہیں دوسری زبانوں میں سمجھانے کی کوشش کی جاتی تا آنکہ وہ اُردو بولنے کے قابل ہو جاتے۔(35)

علوم وفنون کی تعلیم میں مادری زبان کو جو اہمیت حاصل ہے اسے عصری نظام تعلیم میں بڑی مدّت کے بعد سمجھا جا سکا۔یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ میں آتے ہیں اور حافظے میں محفوظ رہتے ہیں وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں۔مگر انگریزی اقتدار کے غلبے نے قوم کا دماغ اس قدر متاثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصے تک اس حقیقت کا سُراغ نہ پا سکی۔ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن اور جامعہ ملّیہ دہلی نے محسوس کیا اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا جس میں دونوں جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور اُنھوں نے دوسری یونیورسٹیوں کیلئے ایک قابل تقلید مثال پیش کی پھر تو ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی جانب سے یہ مطالبہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ ذریعہ تعلیم مادری زبان قرار دی جائے۔(36)

بہر حال اس سلسلے میں اولیت کا سہرا دارالعلوم کے سر ہے، دارالعلوم میں جس چیز کو سو سال پہلے سمجھ لیا گیا تھا۔بیسویں صدی کے ماہرین تعلیم بھی بالآخر اُسی نتیجے پر پہنچنے کیلئے مجبور ہو گئے۔(''حکمت تدریس'' کے تحت جو واقعات درج کئے گئے ہیں اگرچہ ان کا تذکرہ مختلف تصانیف میں ملتا ہے مگر سب کا مفصل ماخذ ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال ہے۔لہٰذا متن کو بہت سے حواشی سے زیر بار نہیں کیا گیا)

ہیئتِ تعلیم:

مولانا محمد قاسم نانوتوی دوررس اور روشن خیال عالم تھے۔مولانا نے طلبہ کیلئے تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کو اسلامی علوم کے حصول کیلئے ضروری خیال کیا۔نیز قرآن وسنت کی تعلیم پر زور دیا۔ان علوم کی تکمیل کیلئے چھ سال کی مدت کو مناسب خیال کیا (37)۔دارالعلوم دیوبند کا دروازہ ہر اُس طالب علم کیلئے کھلا ہوتا جو دینی علوم حاصل کرنا چاہتا۔مگر شرط یہ تھی کہ وہ دارالعلوم کے مقاصد اور اس کے تعلیمی نصب العین سے اتفاق کرتا ہو اور دارالعلوم کے اصول وقوانین کی پابندی کا مکمل عزم لے کر داخلے کا خواستگار ہو۔اس کی زندگی اسلامی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔ان شرائط کے ساتھ اُس کا داخلہ اُس درجے میں ہوتا جس کی وہ استعداد اور صلاحیت رکھتا تھا۔بالعموم داخلہ شوال کے دوسرے ہفتے سے شروع ہو کر تیسرے ہفتے کے آخر تک ہوتا لیکن جدید طلبہ کا داخلہ اس سے کسی قدر پیشتر ہو جاتا۔

داخلے کے وقت جدید اُمیدوار استعداد کے مطابق جس جماعت کے قابل سمجھا جاتا اس میں داخل کیا

جاتا۔کسی دوسری درسگاہ کی سند کی بنا پر داخلہ نہیں ہوسکتا تھا۔البتہ جوطلبہ درجات فارسی سے ترقی پا کر درجہ عربی میں داخل ہوتے وہ داخلے کے امتحان سے مستثنیٰ تھے۔درجہ قرآن مجید اور درجہ فارسی میں داخلہ درخواست کے ذریعے اور درجہ عربی میں مطبوعہ فارم کے ذریعے ہوتا۔فارم داخلہ کی دو قسمیں تھیں: فارم برائے قدیم طلبہ، فارم برائے جدید طلبہ۔قدیم سے وہ طلبہ مراد تھے جنہوں نے سال گذشتہ میں دارالعلوم ہی میں پڑھا ہوا اور نو وارد طلبہ کو جدید سے تعبیر کیا جاتا تھا۔فارم داخلہ کے ذریعے طالب علم اس امر کا وعدہ کرتا کہ وہ مستعدی اور یکسوئی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہے گا اور دارالعلوم کے مروجہ قوانین کی پوری پوری پابندی کرے گا۔ایک طالب علم کو اپنی وضع قطع، نشست وبرخواست اور نوشت وخواند جیسے امور میں وضع ومعاشرت کا پابند رہنا ہوتا تھا۔(38)

داخلے کیلئے عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔البتہ اُن بیرونی کم سن بچوں کو جو دارالاقامہ میں تنہا نہ رہ سکیں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔کسی پیشے کی بنا پر کوئی ایسی پابندی بھی نہیں تھی جس کے سبب قوم کے کچھ افراد پر تعلیم وتعلم کے دروازے بند ہوجائیں بلکہ ہر وہ شخص جسے اکتسابِ علم کا کچھ بھی ذوق ہوتا وہ بغیر کسی رُکاوٹ کے علم حاصل کرسکتا تھا۔عمر اور پیشے کی قید سے مدارس عربیہ ہمیشہ آزاد رہے۔ان میں رنگ ونسل، امیر وغریب اور اونچ ونیچ کا کوئی امتیازی فرق روا نہیں رہا۔اس بناء پر ہر شخص کیلئے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ تھا بلاتکلف اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہیں۔مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علماء وفضلاء ملیں گے جو آبائی طور پر مختلف ادنی واعلیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ایسے لوگ جنہیں اُن کے پیشوں کی وجہ سے دنیا میں نظرانداز کیا جاتا رہا۔مدارس عربیہ کی بدولت انہوں نے علم حاصل کرکے علمی اور سیاسی میدانوں میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے اُن سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔آج جس چیز کو یورپ کی دین سمجھا جاتا ہے اس کی اوّلیت کا شرف درحقیقت ہمارے مدارس عربیہ کو حاصل ہے۔(39)

دارالعلوم دیوبند کی ہیت تعلیم میں درج ذیل شعبہ جات نے بھی موثر کردار ادا کیا:

(1) جمعیت الطلبہ:

طلبہ میں تحریر وتقریر کا ملکہ پیدا کرنے کیلئے جلسوں کی تنظیم اور اداروں کی صلاحیت کو ترقی دینے کیلئے یہ شعبہ قائم کیا گیا۔طلبہ اس کی بہت مشق کرتے کہ دعوت وارشاد کے فریضے کس طرح خوش اسلوبی سے انجام دیئے جاتے ہیں۔جمعیت الطلبہ کے چار شعبے تھے۔شعبہ تقریر عربی، شعبہ تحریر عربی، شعبہ مذاکرہ اور شعبہ مطالعہ۔(40)

(2) دارالافتاء:

دارالعلوم کے قیام کے ساتھ ہی لوگوں نے دینی معاملات میں استفسار شروع کر دیئے۔ابتداءً یہ کام اساتذہ کے سپرد کیا گیا کہ فتاویٰ لکھا کریں مگر یہ کام بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک مستقل شعبہ قائم کرنا پڑا جو مفتی عزیز الرحمان عثمانی کے سپرد کر دیا گیا۔(41)بقول مولانا محمد یوسف بنوری:مفتی عزیز الرحمٰن نے مختلف سوالات کے جوابات میں پچاس ہزار فتاویٰ صادر کئے(42)۔اسوقت سے اب تک وہ لوگ اس خدمت پر مامور ہوتے جنہیں فقہ میں زیادہ سے زیادہ بصیرت حاصل تھی۔روزمرہ کے معمولی مسائل کے علاوہ اہم پیچیدہ وغورطلب مسائل، پنچائتوں کے فیصلے،عدالتوں کی اپیلیں اور مختلف الاحکام فتاویٰ کثرت سے آتے۔یہ دارالافتاء کا فرض رہا ہے کہ وہ دریافت کرنے والوں کو پوری تحقیق اور صحت کے ساتھ مسائل شرعیہ بتائے۔عوام کے علاوہ علماء بھی اکثر مسائل میں اس طرف رجوع کرتے۔دارالافتاء کا کام عام اور خاص مسلمانوں میں ہمیشہ اطمینان اور وقعت کی نظروں سے دیکھا گیا(43)۔1911 ء سے 1951ء کے عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار فتوے دیوبند کے دارالافتاء سے صادر ہوئے۔(44)

(3) شعبہ تبلیغ:

ملک میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ جنگ آزادی سے قبل قاضی بدرالدولہ مدراسی ،عباس علی جاجموی،آل حسن موہانی،مولانا رحمت اللہ کیرانوی،ڈاکٹر وزیرخاں،مولانا فیض احمد بدایوانی جیسے علماء نے ان کا کھل کر مقابلہ کیا۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے یہاں تک کہ دہلی کی مشہور شاہجہانی مسجد کو گرجا میں تبدیل کرنے کے ارادے کئے گئے۔بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ انگریزی حکومت نے ایک خطرناک سازش یہ کی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ہندوستان میں مسلمانوں کا تفوق اور غلبہ رہا تھا۔انگریزوں نے اپنی پالیسیوں کے ذریعہ ہندوؤں کو بڑھایا اور مسلمانوں کو گھٹایا۔(45)

(4) شعبہ تجوید کا قیام:

دارالعلوم میں ابتداءً فن تجوید کا کوئی مستقل شعبہ نہیں تھا لیکن اس کی ضرورت کا احساس برابر کیا جاتا رہا اس کی شدید ضرورت کے پیش نظر مستقل شعبہ تجوید کا اجراء عمل میں لایا گیا اور سب سے پہلے اس شعبہ میں قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی کو بلایا گیا جو قاری عبدالرحمٰن مکی کے تلامذہ میں سے تھے۔(46) ہر طالب علم کیلئے ایک

سال تجوید کی کتاب پڑھنا ضروری قرار دیا گیا۔ طالب علم جب تک فوائد مکیّہ باضابطہ طور پر نہیں پڑھ لیتا اسے فاضل کی سند نہیں دی جاتی تھی۔(47)

(5) شعبہ طب:

اس احساس کے ساتھ ہی کہ فن طب انسانی خدمت کا ایک بہتر ذریعہ ہے اور ایک باعزّت ذریعہ معاش بھی، دارالعلوم میں طبّ کا نصاب شروع کیا گیا اور مہتمم مولانا محمد طیّب نے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت سے جامعہ طِبّیہ کے قیام کی مجلس شوریٰ سے سفارش کی۔ چنانچہ اس کا الگ اجراء اور قیام عمل میں آیا۔ اوّلاً یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ دارالعلوم میں فن طبّ کا ایسا استاد رکھا جائے جو حدیث وغیرہ کے ساتھ ہی فن طبّ کی کتابوں پر بھی بصیرت رکھتا ہو لیکن مستقل شعبہ کی حیثیت سے عمل میں آجانے کے بعد یہ بات تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رکھی جاسکی مگر پھر بھی ایسے ہی اساتذہ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جو اسلاف کے طریقہ اور علم حدیث سے مناسبت رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے جامعہ طِبّیہ سے ہر سال کافی طلبہ فراغت حاصل کرتے رہے۔ اور مختلف مقامات پر کامیابی کے ساتھ مطب چلاتے رہے۔ اس کے ساتھ درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔(48)

(6) دارالعلوم کا کتب خانہ:

اس زمانہ میں ہندوستان کا مشہور عربی کتب خانہ منشی نول کشور کا تھا۔ مختلف سنین کی روئدادوں میں ان کی طرف سے کتابیں بھیجنے کا تذکرہ موجود ہے اور خاص طور پر ان کے تعاون کا شکریہ ادا کیا گیا۔ موصوف نے جب اپنا اخبار ''اودھ'' کے نام سے نکالا تو وہ اسے بھی دارالعلوم کے لئے پابندی کے ساتھ بلا قیمت بھیجتے رہے۔ اس طرح راؤ امرسنگھ نے اپنا اخبار ''سفیر بڈھانہ'' بھی دارالعلوم کیلئے بلا قیمت بھیجنا شروع کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ قسطنطنیہ سے ''الجواب'' نامی عربی اخبار بلا قیمت یہاں آنے لگا۔ یہی کتب خانہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک وسیع رقبہ میں پھیل گیا۔ اس میں کم وبیش ڈیڑھ لاکھ کتابیں تھیں(49)۔ اسلامی کتب کا جتنا بڑا ذخیرہ دارالعلوم کے کتب خانہ میں تھا برصغیر میں اس کی کوئی مثال نہیں۔ ہندوستان کے بہت سے عالموں کے کتب خانے ان کی وفات کے بعد یہاں منتقل ہوتے رہے۔ پہلے پہل یہ کتابیں احاطہ نودرہ کے بعض کمروں میں تھیں لیکن بعد میں اس کی عمارت کا دارالمشورہ سے متصل دوسری منزل پر سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جو اس وقت اُردو ہال کے نام سے موسوم تھا۔(50)

اس کتب خانہ کی پہلی تنظیم مولانا عبدالحفیظ صاحب دربھنگوی نے کی جو شیخ الہند کے ممتاز شاگرد تھے۔ بعد

میں دوسرے علماء نے یہ ترتیب جاری رکھی۔ بعدازاں دارالعلوم کی جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر اس کی جدید ترتیب ضروری سمجھی گئی۔ چنانچہ مدیر کتب خانہ کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی۔اب ترتیب زبان وار اورفن وار ہے۔ جدید تقاضوں کے مطابق اس کتب خانہ میں کارڈ سسٹم جاری کیا گیا۔اس کے بعد مہتمم نے اکابر دارالعلوم کی تصانیف کیلئے الگ ایک کمرہ مخصوص کیا اوراس میں ہر مصنف کی کتابیں مہیا کی گئیں۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے لیکر اس وقت تک کے اکابر علماء کی تصانیف کا ذخیرہ اس میں موجود ہے۔قلمی کتابوں کا دوضخیم جلدوں میں تعارف لکھا گیا اور چھپوایا گیا۔دنیائے علم میں یہ سعی اور خدمت بہت سراہی گئی۔(51)

اصول ہشتگانہ دارالعلوم دیوبند:

منتظمین دارالعلوم کی نظر وسائل وذرائع کی بجائے ہمیشہ خالق کائنات کے فضل وکرم پر رہی۔دراصل یہ ہی وہ سرمایہ توکل تھا جس کے اعتماد اور بھروسے سے بڑے بڑے کام دارالعلوم میں شروع کردیئے گئے اور وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پورے ہوگئے۔دارالعلوم کے خزانے میں کسی وقت بھی اتنی رقم جمع نہیں رہی جو دوتین ماہ کے مصارف کیلئے کافی ہوسکے۔دارالعلوم کے آمدوصرف کی بنیاد ہمیشہ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰه فَهُوَ حَسْبُهٗ پر رہی۔(52) روز بروز دارالعلوم مرحلہ وار ترقی کرتا رہا۔سرپرست مدرسہ مولانا نانوتوی کے مطابق عالمِ مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق ہانڈی کی ہے۔جب تک اس کا مدار توکل اوراعتماد اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔ساتھ ہی آپ نے دارالعلوم کیلئے زرین اصول بھی خود تحریر کئے۔یہ اصول بظاہر سادہ مگر درحقیقت الہامی اور بڑے دوررس تھے۔یہاں ہم یہ اصول جن کی تعداد آٹھ ہے پیش کرتے ہیں۔(53)

- تامقدور کارکنان مدرسہ کی نظر ہمیشہ تکثیر چندہ پر رہے وہ کوشش کریں اوراوروں سے بھی کروائیں۔ خیراندیشان مدرسہ یہ بات ہمیشہ یادرکھیں
- انتظام طعام طلبہ، بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہوسکے خیراندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔
- مُشیران مدرسہ ہمیشہ یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ مدرسہ کی خوبی اورخوش اسلوبی ہو،اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ اگراس طرح کی نوبت آئے کہ اہل مشورہ کواپنی مخالفت رائے اوراوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہوتو اس سے مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبی ءمدرسہ ملحوظ رہے۔سخن پروری نہ ہو۔سامعین بنیتِ نیک اسے سنیں یعنی یہ خیال

رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آ جائے گی تو وہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بدل وجان قبول کریں گے ۔ نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں۔ یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اس وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی تعداد معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو، تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتے ہیں۔

- یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں، اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔

خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۔خواندگی مقررہ اس انداز سے ہو جو پہلے تجویز ہو چکی ہے۔ یا بعد میں کوئی اور انداز مشورے سے تجویز ہو تو وہ پورا ہو جایا کرے، ورنہ مدرسہ اوّل خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۔ جب تک کی آمدنی کی آمدن کی کوئی سبیل یقینی نہیں، تب تک یہ مدرسہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اگر آمدنی کی کوئی ایسی یقینی صورت حاصل ہوگئی، جیسے جاگیر، کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

- سرکار کی اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔(54)
- ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جنہیں اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو، اہل حسن نیت کا چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔(55)

ان اصولوں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیسے جامع اور کتنی عمدہ ہدایات پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ ان میں تنظیم مدارس کا پورا منصوبہ اور جذبہ کارفرما ہے۔ اراکین شوریٰ، مہتمم مدرسہ، مدرسین اور کارکنان مدرسہ سبھی کیلئے

ان میں روشنی موجود ہے۔تکثیر چندہ اوراس کیلئے سعی،طلبہ کی امداداوراس میں اضافہ،اراکین شوریٰ کا مخلص،صاف گو اور ہمدردِ مدرسہ ہونا اور مہتمم مدرسہ کا مشورہ طلب امور میں مشورہ کرنا کسی دور اندیش سے مخفی نہیں مگر بانی کی وصیت کے مطابق جب کوئی متعین آمدنی نہ ہوگی تو اللہ پر اعتماد ہوگا اور یوں دعاؤں کے ساتھ سعی مسلسل بھی ہوگی۔پھر اس کے نتیجہ میں غیبی امداد کے دروازے بھی کھلے رہیں گے۔اسی وجہ سے ارباب مدرسہ کو سرکار وامراء کی امداد سے حتی الوسع اجتناب کا مشورہ دیا گیا۔(56)

دارالعلوم کا آغاز جس بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا اسے دیکھتے ہوئے دارالعلوم کے نظم ونسق کا مشاورت کے اصول پر مبنی ہونا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ہندوستان میں اس وقت جمہوری نظام سے لوگ عام طور پر آشنا یا مانوس نہ تھے۔دارالعلوم نے اسلامی طرز پر مجلس شوریٰ کی بنیاد رکھی اور یہ نظام کامیابی کے ساتھ چلا کر قوم کے سامنے ایک عمدہ مثال قائم کردی۔اس طرز فکر کا یہ نتیجہ نکلا کہ انتظامات میں بڑی وسعت کے ساتھ جمہوری انداز بھی قائم ہوگیا۔ ارباب مشورہ میں جو صفات ضروری ہیں۔اس کی نسبت مولانا نانوتوی نے اپنے تحریر کردہ دستورالعمل کی تیسری دفعہ میں جو ہدایت فرمائی تھی اس سے تعمیری نکتہ چینی کی راہ کھل گئی جو کسی ادارے کی ترقی کیلئے بڑی ضروری ہے۔(57)

دارالعلوم میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک مفت انتظام تھا۔ہر سال تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ تعلیم سے فارغ ہوتے تھے۔جن کے لئے خوردونوش،گرمی اور سردی کے کپڑے،دارالاقامہ میں جگہ،روشنی،پانی،علاج اور زیردرس کتب کا بھی مفت انتظام کیا جاتا تھا۔یہ سارے مصارف چندے سے پورے ہوتے تھے۔دارالعلوم دنیا میں ایک آزاد تعلیم گاہ تھی جہاں ہر شخص بقدر واستعداد علم حاصل کرسکتا تھا۔دارالعلوم کے ابتدائی درجات میں مسلمان بچوں کے دوش بدوش ہندو بچے بھی تعلیم پاتے تھے۔دارالعلوم میں جن قواعد پر عمل ہورہا تھا ان میں پہلی دفعہ یہ تھی کہ چندے کی کوئی مقدار نہیں اور نہ خصوصیت مذہب وملّت ہے۔(58)

اسی بنا پر دارالعلوم میں غیر مسلموں کا چندہ بھی ہمیشہ بے تکلفی سے قبول کیا جاتا رہا۔چنانچہ روداد ہائے دارالعلوم چندہ دہندگان کی فہرست میں جابجا ہندوؤں کے چندے بھی درج ہیں۔ابتدائی سالوں کی رودادوں میں تو اکثر ہندو چندہ دینے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔مگر درمیانی اور آخری سالوں میں بھی کہیں کہیں ہندوؤں کے نام مل جاتے ہیں۔(59) دارالعلوم کا چندہ مذہب وملّت کی تخصیص سے بالاتر رکھا گیا تھا۔حکومت کی امداد کبھی قبول نہیں کی گئی تھی۔اس بارے میں مولانا نانوتوی کی اس بنیادی ہدایت پر عمل کیا گیا تھا کہ سرکار اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔(60)

برطانوی دورحکومت میں بارہا ایسے مواقع پیش آئے مگر دارالعلوم کے اکابر اپنی راویت پرسختی کے ساتھ قائم رہے۔ 1957ء میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد جب دارالعلوم آئے تو انہوں نے دارالعلوم کی عظیم علمی خدمات کے پیش نظر فیصلہ کیا کہ وہ حکومت کی جانب سے دارالعلوم کو ایک گراں قدر امداد دینا چاہتے ہیں تو دارالعلوم کی جانب سے سابقہ روایات کے مطابق شکریے کے ساتھ معذرت کردی گئی ۔مگر جب صدر جمہوریہ نے اپنی طرف سے ایک ہزار روپے دینے چاہے تو اسے خوشی سے قبول کرلیا گیا۔ 1870ء میں جب کتب کی ضرورت کیلئے دارالعلوم کی جانب سے اہل مطابع کے نام اپیل کی گئی تو اس باب میں پیش قدمی کرنے کی سعادت ہندوستان کے مشہور ناشر منشی نول کشور کو حاصل ہوئی۔(61)

دارالعلوم کی جانب سے طلبہ کے قیام وطعام ،لباس ،علاج اور دوسری لازمی ضروریات کا بندوبست کیا جاتا تھا۔لیکن اجرائے وظائف میں یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ طلبہ میں تعلیمی امور سے بے رغبتی اور مفت خوری کی عادت پیدانہ ہونے پائے۔ بلکہ وہ ہمہ تن تعلیمی مشاغل میں منہمک رہیں۔اس لئے تمام وظائف ایک سال کیلئے جاری کئے جاتے تھے۔ایک سال بعد ان کی تجدید ہوتی تھی۔طالب علم اگر کسی وقت بھی امتحان میں ناکامیاب ہوتا تو وظیفہ بند کردیا جاتا تھا تا آنکہ وہ اجرائے امداد کے قانون کے مطابق اوسط درجے کی کامیابی حاصل نہ کرلیتا۔البتہ دارالاقامہ میں قیام کے لئے جگہ اور کتب خانہ سے سال متعلقہ کی زیردرس کتب بلاتخصیص مستحق وغیر مستحق ہر طالب علم کو چند روز کے لئے مُفت دی جاتی تھیں۔وظیفے کی دو قسمیں تھیں۔کھانا اور نقد۔(62)

کھانے کیلئے مطبخ تھا جہاں سے ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتیں جو 250 گرام آٹے کی ہوتی تھیں۔دوپہر کو دال اور شام کو کھانے میں گوشت دیا جاتا تھا۔کھانے کے علاوہ مختلف مقدار میں نقد وظائف بھی دیئے جاتے جو پچاس روپے ماہانہ تک ہوتے تھے۔یہ دونوں قسم کے وظائف دارالعلوم کی اصطلاح میں ''امداد'' کہلاتے تھے۔جن طلبہ کی امداد جاری ہوجاتی انہیں سال بھر میں چار جوڑے کپڑے ،دو جوڑی جوتے اور سردی کے موسم میں لحاف بھی دیا جاتا تھا۔(63)

حجروں میں روشنی اور کپڑوں کے دھلائی کیلئے ماہانہ ووظیفہ مقرر تھا۔بیمار طلبہ کے علاج کیلئے معالج مقرر تھے۔طلبہ کو دوا مفت مہیا کی جاتی اور کھانا پرہیزی ملتا تھا۔ان امور کے علاوہ احاطہ دارالعلوم کی تمام گزرگاہوں میں روشنی ،اقامت گاہوں میں پانی کے نل اور موسم سرما میں مسجد دارالعلوم میں گرم پانی کا انتظام خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا۔دارالعلوم میں داخل تمام طلبہ کو کتب خانے سے زیردرس کتابیں کسی معاوضے کے بغیر ایک سال کیلئے مستعار دی

جاتیں۔ طالب علم کو مالی امداد ملتی ہو یا نہ۔ دونوں صورتوں میں اس سے دارالاقامہ کے کمرے کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا تھا۔(64)

دارالعلوم کے قیام کے پہلے سال ہی یہ اعلان کیا گیا تھا کہ دارالعلوم طلبہ کو قیام کے ساتھ طعام کی سہولت بھی مہیا کرے گا۔ عرصہ تک اس کی صورت یہ رہی کہ شہر دیوبند کے خوشحال گھرانوں کے ذمہ ایک یا دو طالب علموں کو حسب توفیق کھانا دینا طے کیا گیا۔ اور وہ کھانا دیتے رہے۔ جن کا انتظام گھروں میں نہیں ہوا تو انہیں نقد وظائف دیئے جاتے تھے۔ جس سے وہ خود اپنے کھانے کا انتظام کرتے تھے۔ مگر جب طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور شہر والوں کو ان سب کو کھانا دینا مشکل ہوگیا اور ادھر نقد وظائف پانے والے طلبہ کا قیمتی وقت کھانا پکانے میں ضائع ہونے لگا تو ارباب مدرسہ نے مطبخ جاری کر دیا۔ اسکے لئے معقول تعداد میں ملازمین رکھے گئے۔ پھر غیر مستطیع طلبہ کو بلا قیمت اور مستطیع طلبہ کو قیمتاً مطبخ سے پکا ہوا کھانا دینے کا انتظام کیا گیا۔ اس شعبہ سے ڈیڑھ سے دو ہزار طلبہ تک کا کھانا دونوں وقت روزانہ تیار کیا جاتا اور تقسیم کیا جاتا۔ (65)

دارالعلوم دیوبند اور نظام امتحانات:

یہ کہنا تو آسان نہیں کہ اُس وقت مدارس عربیہ میں امتحانات کا عام طریقہ مروج تھا۔ تاہم بعض مدارس کے حالات سے چلتا ہے کہ ان میں طلبہ کا سالانہ امتحان لیا جاتا تھا چنانچہ بیجاپور کی تاریخ بستان السلاطین میں وہاں کے مدارس کے حالات میں لکھا ہے کہ: ہر سال امتحان می شد(66)۔ مگر قیام دارالعلوم کے قریبی زمانہ میں یہ رواج ترک کیا جاچکا تھا اور مدارس عربیہ میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کا طریقہ جو طالب علم کی استعداد کا اندازہ کرنے کا ایک مناسب ذریعہ ہے، مروج نہیں تھا۔ طالب علم جب استاد سے ایک کتاب پڑھ لیتا تو دوسری کتاب بغیر امتحان لئے شروع کرادی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں طالب علم کی استعداد جانچنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ بسا اوقات نالائق طالب علم بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا تھا۔ دارالعلوم نے یہ نقص محسوس کرتے ہوئے یہ طریقہ ختم کیا اور سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان لازمی قرار دیئے۔(67)

دارالعلوم میں مروج امتحانی قواعد کافی سخت تھے۔ یہاں پرائیویٹ امتحان کا قاعدہ نہیں تھا۔ ہندوستان کے مدارس میں غالباً بیجاپور ہی کی یہ خصوصیت تھی کہ وہاں سالانہ امتحان ہوتا تھا۔ ورنہ دوسرے مدارس کی تاریخ میں سالانہ امتحان کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے متصل زمانے میں ہندوستان میں سالانہ امتحان کا قطعاً رواج نہ تھا۔

قوانین امتحانات:

امتحان جو طلبہ کی تعلیمی استعداد اور اساتذہ کی محنت کی جانچ ہے اور جس پر ترقی درجات کا انحصار ہے، بہت ضروری ہے۔لیکن جس طرح دارالعلوم کو حکومت کے اثر سے بالکل علیحدہ رکھا گیا اسی طرح امتحان میں کسی بیرونی مداخلت کو بھی پسند نہیں کیا گیا۔نصاب تعلیم خود اسکا اپنا مجوزہ تھا اور امتحانات بھی وہ خود ہی اپنی نگرانی میں لیتا تھا۔

امتحانات دو قسم کے ہوتے تھے۔ایک امتحان داخلہ: یہ ان طلبہ کا ہوتا جو کسی دوسرے مدرسہ سے آ کر دارالعلوم میں داخل ہونا چاہتے۔یہ امتحان عام طور سے شوال میں ہوتا۔اس امتحان میں خاصی سختی برتی جاتی تھی۔بسا اوقات نصف سے زائد طلبہ ایسے ہوتے جنہیں امتحان میں ناکام ہونے کے باعث واپس ہو جانا پڑتا۔دوسرا امتحان خواندگی۔یہ سال میں تین مرتبہ لیا جاتا تھا۔سہ ماہی ماہ صفر میں اور ششماہی ماہ جمادی الاوّل میں۔سالانہ امتحان رجب کے آخری ہفتہ سے شروع ہو کر شعبان کے عشرۂ دوم میں ختم ہوتا تھا۔(68)

امتحانات میں سخت نگرانی کی جاتی۔پہلے اور دوسرے سال کی تمام اور تیسرے سال کی چند کتابوں تک کا امتحان زبانی سوال وجواب کے ذریعے لیا جاتا۔اوپر کی جماعتوں کا امتحان تحریری ہوتا۔سوالات کے پرچے نہایت احتیاط اور رازداری سے چھپوائے جاتے تھے۔امتحان میں جوابات کیلئے چار گھنٹے وقت دیا جاتا۔نشستیں متعین ہوتی تھیں۔اس میں خاص اہتمام رکھا جاتا کہ طالب علم ایک دوسرے سے بات نہ کرنے پائیں۔کوئی بھی طالب علم خلاف ورزی کی صورت میں امتحان سے محروم کر دیا جاتا تھا۔امتحان کے مفروضہ نمبر 50 تھے۔امتحان کے درجات کی تفصیل یہ تھی۔

30 سے 36 تک.....ادنیٰ　　37 سے 43 تک.....متوسط

44 سے پچاس تک.....اعلیٰ

دارالعلوم سے پہلے ہندوستان میں جتنے بھی تعلیمی مراکز تھے ان کی حیثیت بالعموم شخصی درس گاہوں کی سی تھی اور ان سب میں یہ قدر مشترک تھی کہ ان میں نہ جماعت بندی تھی نہ حاضری کے رجسٹر ہوتے تھے۔اور نہ ہی طلبہ کو مجبور کیا جاتا تھا کہ فلاں کتاب اور فن کے ساتھ فلاں کتاب اور فن کا لینا ضروری ہے۔مطلق آزادی تھی جس کا جو جی چاہتا تھا پڑھتا تھا۔اور جب تک چاہتا پڑھتا تھا۔تعلیم کی کوئی مدت متعین نہ تھی۔نیز امتحان کا بھی کوئی خاص دستور نہ تھا۔جماعت بندی، مدت تعلیم، حاضری، لازمی امتحان اور تناسب مضامین وغیرہ جیسے امور کے اجراء کی اوّلیت دارالعلوم ہی کو حاصل تھی۔یہیں سے مدارس عربیہ میں یہ امور رواج پذیر ہوئے۔(69)

تقسیم انعام:

طلبہ میں تعلیمی مشاغل کے لئے ترغیب اوران میں مسابقت کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے سالانہ امتحان میں کامیابی پر طلبہ کو مستحقِ انعام سمجھا جاتا تھا۔ جو طالب علم اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا اسے خصوصی انعام دیا جاتا۔انعام میں طالب علم کی استعداد کے مطابق درسی وغیر درسی کتب دی جاتی تھیں(70)۔ دارالعلوم میں بعض دوسرے امور کی طرح شروع ہی سے تقسیم انعامات کا بھی رواج تھا۔تقسیم انعامات کے عنوان سے ہر سال جو جلسہ منعقد کیا جاتا اس میں مقامی لوگوں کے علاوہ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی دعوت شرکت دی جاتی ۔اس اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان عموماً اور چندہ دہندگان خصوصاً اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ انہوں نے اپنی جس نوخیز نسل کو دارالعلوم کے سپرد کیا تھا اس کے تعلیمی نتائج کیا برآمد ہوئے نیز یہ کہ قوم نے جو روپیہ دارالعلوم کو دیا اس کے مصرف کا منظر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ دارالعلوم کا پہلا جلسہ دستار بندی 1290ھ، دوسرا 1292ھ اور تیسرا 1301ھ میں منعقد ہوا۔(71)

تصدیق نامہ اور سند و دستار جو طلبہ نصاب دارالعلوم کی تکمیل کر کے سالانہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر لیتے انہیں سند دی جاتی۔سند میں ہر پڑھی ہوئی کتاب کا نام درج کیا جاتا مگر جس کتاب کے امتحان میں 30 سے کم نمبر ہوتے وہ داخل سند نہ کی جاتی۔ درجہ فارسی، درجہ تجوید اور شعبہ طب کی علیحدہ علیحدہ اسناد تھیں۔ جو طلبہ تکمیل سے قبل دارالعلوم چھوڑ دیتے۔انہیں امتحان میں کامیاب کتب کا تصدیق نامہ دے دیا جاتا۔ درجہ چہارم پاس کر لینے پر ''عالم'' کی سند اور درجہ ہشتم کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ''فاضل'' کی سند دی جاتی تھی(72)۔سند میں ان کتب کے ناموں کے علاوہ (جن کا امتحان دیا جا چکا ہوتا) طالب علم کی ذہنی استعداد کا بھی ذکر ہوتا۔ نیز اس بات کی شہادت دی جاتی کہ اس نے دارالعلوم میں تعلیم پائی ہے۔علوم وفنون میں مہارت رکھتا ہے۔درس وتدریس اور افتاء کا اسے حق حاصل ہے۔اس کے علاوہ اسکے اخلاق اور چال چلن کے متعلق بھی اظہار رائے کیا جاتا تھا۔سند مطبوعہ ہوتی تھی جو مہتمم اور اساتذہ کے دستخط اور دارالعلوم کی مہر سے مزین ہوتی تھی۔ جو طلبہ علوم وفنون میں امتیازی استعداد کے مالک ہوتے انہیں سند دینے کے علاوہ قدیم درس گاہوں کی روایت کے مطابق مجمع عام میں اساتذہ ان کی دستار بندی کرتے تھے۔ مدارس عربیہ کی اصطلاح میں یہ ''دستارِ فضیلت'' کہلاتی تھی۔(73)

نتائج:

دارالعلوم دیوبند کے تاریخی پس منظر، مقاصد، نصاب تعلیم، حکمت تدریس، ہیت تعلیم، اصول ہشتگانہ، نظام امتحانات پر تحقیق سے یہ نتائج سامنے آئے۔

- دارالعلوم علوم دیوبند ایک قدیم طرز کی درس گاہ نہیں بلکہ احیائے اسلام وقیام ملت کی ایک عظیم الشان تحریک تھی جس نے مسلمانوں کا ذہنی جمود توڑا، برٹش

استعمار کا سحر توڑا، وقت کی جابر قوتوں سے پنجہ آزمائی کی اور افراد کے ذہنوں سے خوف وہراس دور کیا۔

- عدم اتباع سلف اور مغربیت کا فتنہ دین میں داخل ہونے لگا تو اس تحریک نے دلائل سے اس کی کامیاب مدافعت کی۔ بلکہ ایک ایسی مستقل حکمت عملی تیار کی جس کے سامنے کوئی فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا تو اس نے فلسفہ کا انداز پہچان کر اسے اپنے راستے پر روک لیا۔

- دارالعلوم نے لاکھوں جیّد علماء پیدا کئے جنہوں نے دنیا کے مختلف خطوں میں لاکھوں دینی مدارس قائم کئے بلکہ اس کے فارغ التحصیل دنیائے اسلام کے مرکز مکہ اور مدینہ میں مدرسۃ الشرعیہ وغیرہ جیسی اسلامی علوم کی درس گاہیں قائم کر کے اسلامی تعلیمات کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ ان علماء نے شریعت، طریقت، تفسیر، حدیث، درس وتدریس، خدمت خلق، تصنیف وتالیف، تحریک آزادی، اتحاد امت اور تحریک پاکستان کے میدانوں میں وہ شہرۂ آفاق تعمیری کردار ادا کیا جس نے جنوبی ایشیاء کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ غرض کہ مسلمانوں کی علمی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود نہ ہوں۔

حوالہ جات

1۔ محمد شفیع، مولانا مفتی 1976ء ص143

2۔ محولہ عبدالحمید صدیقی 1965ء، ص31

3۔ مقبول جہانگیر (س ن)، ص32

4۔ شمس القمر قاسمی 1973ء، ص121

5۔ شبیر، بخاری سیّد 1986ء، ص74

6۔ محمد طیب 1972ء ص18

7۔ حبیب الرحمٰن، مولانا 1981ء، ص7

8۔ محمد طیب، قاری 1991ء، ص175
9۔ محمد ایوب، قادری 1983ء، ص155
10۔ عارف چوہدری 1980ء، ص9
11۔ محمد طیب 1972ء، ص12
12۔ خورشید احمد (س ن)، ص100
13۔ محمد شفیع، مفتی 1976ء، ص143
14۔ محمد الیاس فارانی 1968ء، ص120
15۔ محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء، ص53
16۔ محبوب، رضوی سیّد 1950ء، ص94
17۔ شمس تبریز 1981ء، ص28
18۔ محمد خلیل اللہ 1983ء، ص156-157
19۔ عبدالرشید ارشد، ڈاکٹر 1995ء، ص31
20۔ محبوب، رضوی سیّد 2005ء الف، ص281
21۔ دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء، ص38
22۔ محمد ایوب، قادری 1966ء، ص200-202
23۔ خالد یار خان 196ء، ص273
24۔ دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء، ص37
25۔ محبوب، رضوی سیّد 1972ء، ص329
26۔ ویب سائٹ سٹوری آف پاکستان 2002ء، ص1
27۔ محمد اکرام، شیخ 1975ء، ص605-606
28۔ خورشید احمد، پروفیسر (س ن)، ص106
29۔ سہ روزہ ''دعوت''، دہلی 16 اکتوبر 1999ء، ص9
30۔ محبوب، رضوی سیّد 2005ء ب، ص279
31۔ محبوب، رضوی سیّد 1976ء، ص190
32۔ محمد رفیع، مولانا مفتی 1389ھ، ص110

33۔ انظر، شاہ سیّد مولانا 1976ء، ص312-313

34۔ محبوب، رضوی سیّد 1980ء، ص263

35. Barbra Daly Metcalf 1989,P:102 عبدالصمد صارم 1976ء، ص303-304

36۔ ایچ۔ بی خان 1985ء، ص33

37۔ محمد ایوب، قادری پروفیسر 1966ء، ص200

38۔ محبوب، رضوی سیّد 1980ء، ص267

40۔ محمد طیب، مولانا 1972ء، ص32

41۔ محمد طیب 1965ء، ص100

42۔ حافظ اکبر، شاہ بخاری 2001ء، ص195

43۔ محمد عبداللہ سلیم 1976ء، ص203-204

44۔ مناظر احسن، گیلانی سیّد 1953ء، ص386

45۔ محمد ایوب، قادری پروفیسر 1983ء، ص157

46۔ اظہار احمد، تھانوی 1976ء، ص650

47۔ دفتر اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند 1981ء، ص24

48۔ مناظر احسن، گیلانی سیّد (س ن) ب، ص328

49۔ احسان دانش 1976ء، ص497

50۔ محمد طیب، مولانا (س ن)، ص30

51۔ محبوب، رضوی سیّد 2005ء الف، ص372

52۔ محبوب، رضوی سیّد 1972ء، ص337

53۔ محمد طیب' قاری 1991ء، ص172-173

54۔ محمد اکرام، شیخ 2004ء، ص141

55۔ محمد یوسف، قریشی 1404ھ، ص81

56۔ خورشید احمد' پروفیسر 1977ء، ص82

57۔ محمد ایوب، قادری پروفیسر 1983ء، ص156

58۔ محبوب، رضوی سیّد 2005ء الف، ص158-159

59۔ مناظر احسن، گیلانی سیّد (س ن) ب، ص317
60۔ محبوب، رضوی سیّد 1972ء، ص33-339
61۔ مناظر احسن، گیلانی سیّد (س ن) ب، ص314
62۔ محبوب، رضوی سیّد 2005ء الف، ص225
63۔ محمد طیب، مولانا 1972ء، ص89
64۔ دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء، ص19-20
65۔ محمد طیب، قاری (س ن)، ص30
66۔ محمد میاں' سیّد مولانا 2004ء، ص131
67۔ مناظر احسن' گیلانی سیّد (س ن) الف، ص34
68۔ محبوب' رضوی سیّد 1980ء' ص268
69۔ محبوب' رضوی سیّد 2005ء ب، ص297
70۔ محبوب' رضوی سیّد 2005ء ب، ص187
71۔ نفیس الدین' صدیقی پروفیسر 2001ء، ص124
72۔ محمد طیب' قاری مولانا (س ن)، ص36
73۔ محمد شفیع 1366ھ، ص15

کتابیات

متفرق کتب:

1۔ ایچ۔بی۔خان (1985ء)، برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق و تاریخ وثقافت
2۔ حافظ اکبر، شاہ بخاری (2001ء)، امام الفقہاء حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، چالیس بڑے مسلمان، کراچی: ادارۃ القرآن
3۔ خالد یار خان (1963ء)، تاریخ التعلیم، لاہور، اردو مرکز
4۔ خورشید احمد (س ن)، نظام تعلیم، نظریہ، روایت، مسائل، اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
5۔ دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند (1981ء)، دارالعلوم دیوبند کے 117 سال، لاہور، ادارہ اسلامیات

6۔ شبیر، بخاری سیّد (1986ء)، میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم، لاہور، آئینہ ادب
7۔ شمس القمر، قاسمی (1973ء)، روداد برصغیر، لاہور، عزیز پبلی کیشنز
8۔ عبدالحمید صدیقی (1965ء)، مقدمہ، میکالے کا نظریہ تعلیم، اردو ترجمہ، کراچی، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی
9۔ عبدالرشید ارشد، ڈاکٹر (1995ء)، پاکستان میں تعلیم کا ارتقاء، لاہور، ادارہ تعلیمی تحقیق
10۔ محبوب، رضوی سیّد (1950ء)، دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات، دیوبند
11۔ محبوب، رضوی سیّد (1972ء)، تاریخ دیوبند، دیوبند، یوپی، علمی مرکز
12۔ محبوب، رضوی سیّد (2005ء الف)، تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول، لاہور، ادارہ اسلامیات پاکستان
13۔ محبوب، رضوی سیّد (2005ء ب)، تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد دوم، لاہور، ادارہ اسلامیات
14۔ محمد اکرام، شیخ (1975ء)، رود کوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان
15۔ محمد اکرام، شیخ (2004ء)، موج کوثر، راولپنڈی، سروسز بک کلب
16۔ محمد الیاس فارانی (1968ء)، برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء، کراچی، ادارہ مطبوعات پاکستان
17۔ محمد ایوب، قادری (1966ء)، مولانا محمد احسن نانوتوی، کراچی
18۔ محمد سلیم، پروفیسر سیّد (1993ء ج)، دینی مدارس کیلئے نصاب نو کی تجاویز، لاہور، ادارہ تعلیمی تحقیق
19۔ محمد شفیع (1366ھ)، مقدمہ، فتاوٰی دارلعلوم دیوبند، دیوبند
20۔ محمد طیب (1965ء)، دارالعلوم دیوبند، دیوبند، اہتمام دفتر دارالاالعلوم
21۔ محمد طیب، مولانا (1972ء) تاریخ دارالعلوم دیوبند، کراچی، دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ
22۔ محمد طیب، قاری مولانا (س ن) مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند، بیس بڑے مسلمان، لاہور، مکتبہ المعارف العلمیۃ
23۔ محمد میاں، سیّد (2004ء)، علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد پنجم، کراچی، مکتبہ رشیدیہ
24۔ محمد یوسف، قریشی (1404ھ)، سفرنامہ ہند، پشاور، موتمر المؤلفین جامعہ اشرفیہ
25۔ مقبول جہانگیر (س ن)، داستان سرفروشوں کی، لاہور، مکتبہ اردو ڈائجسٹ
26۔ مناظر احسن، گیلانی (1953ء)، سوانح قاسمی، دیوبند
27۔ مناظر احسن، گیلانی (س ن) الف، سوانح قاسمی جلد اول، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار
28۔ مناظر احسن، گیلانی (س ن) ب، سوانح قاسمی حصہ دوم، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار
29۔ نفیس الدین، پروفیسر صدیقی (2001ء) سرپرست دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، چالیس بڑے مسلمان، کراچی، ادارۃ القرآن

رسائل:

30۔ احسان دانش (1976ء)، اکابر دیوبند، ماہنامہ الرشید (4)2-3، لاہور

31۔ اظہار احمد تھانوی (1976ء)، دارالعلوم دیوبند اور تجوید وقرات، ماہنامہ الرشید (4)2-3، لاہور

32۔ انظر شاہ، مولانا سیّد (1976ء)، دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث، ماہنامہ الرشید (4)2-3، لاہور

33۔ حبیب الرحمٰن، مولانا (1981ء)، چودھویں صدی ہجری کی ایک دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید (9)3، ساہیوال

34۔ شمس تبریز (1981ء)، اسلام کا جامع نظریہ تعلیم اور دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید (9)8-9، ساہیوال

35۔ عبدالصمد صارم (1976ء)، دارالعلوم دیوبند کی ادبی خدمات، ماہنامہ الرشید (4)2-3، لاہور

36۔ محبوب، رضوی سیّد (1976ء)، دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات، ماہنامہ الرشید (4)2-3، لاہور

37۔ محبوب، رضوی سیّد (1980ء)، تاریخ دارالعلوم دیوبند نمبر، ماہنامہ الرشید (8)4-5، ساہیوال

38۔ محمد رفیع، مولانا مفتی (1399ھ)، حیات مفتی اعظم، ماہنامہ البلاغ (13)6، دیوبند

39۔ محمد شفیع، مولانا مفتی (1976ء)، دارالعلوم دیوبند اور اس کا مزاج و مذاق، ماہنامہ الرشید، دارالعلوم دیوبند نمبر (4)2-3، لاہور

40۔ محمد عبداللہ سلیم، قاری مولانا، (1976ء)، دارالافتاء۔۔۔دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید (4)2-3، لاہور

مجلّے:

41۔ خورشید احمد، پروفیسر (1977ء)، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم، مجلّہ محور، تعلیم نمبر، لاہور، پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین

42۔ محمد ایوب، قادری پروفیسر (1983ء)، دارالعلوم دیوبند، مجلّہ تعلیم، 18 نومبر 1983ء، کراچی، شعبہ تصنیف و تالیف وترجمہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج

43۔ محمد خلیل اللہ، پروفیسر (1983ء)، اسلامی نظریہ اور نصاب تعلیم، مجلّہ تعلیم، 18 نومبر 1983ء، کراچی، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج

44۔ محمد طیب، قاری (1991ء)، دارالعلوم دیوبند، مجلّہ (2)1-4، کراچی

اخبارات وجرائد:

45۔ اداریہ، سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، 16 اکتوبر 1999ء

انگریزی کتاب:

46. Barbara Daly Metcalf. (1989). *Islamic Revival in British India. Deoband, 1860-1900.* Karachi: Royal Book Company.

Website:

47. www.storyofpakistan.com. (2002). Deoband Movement (1886-1947)